TAMSAAL
ISSN Print: 3007-5939
ISSN Online: 3007-5947
Volume 4, Number 8, 2026, Pages 462 – 475
Journal Home Page
https://tamsaal.pk/index.php/tamsaal/index

قرۃ العین حیدر کے عہد کا تاریخی، سیاسی اور فکری پس منظر

The Historical, Political, and Intellectual Background of Qurratulain Hyder's Era

Saeed Ahmad[1], Dr. Imtiaz Hussain Baloch[2]

[1]*Scholar PhD Urdu, University of Southern Punjab, Multan, Email: murshidsaeednasir@gmail.com*
[2]*Professor, Head of Urdu Department, University of Southern Punjab, Multan, Email: imtiazhussain@usp.edu.pk*

ARTICLE INFO

Article History:

Received:	*July*	*09, 2026*
Revised:	*August*	*12, 2026*
Accepted:	*August*	*20, 2026*
Available Online:	*August*	*27, 2026*

Keywords:
Qurratulain Hyder; Aag Ka Darya; Literary Consciousness; Historical Consciousness; Indian Subcontinent; British Colonialism; War of Independence 1857; Nationalism; Progressive Thought; Cultural Identity; Tradition and Modernity; History and Imagination; Urdu Literature; Intellectual Heritage

Corresponding Author:
Dr. Imtiaz Hussain Baloch
Email:
imtiazhussain@usp.edu.pk

DOI: *https://doi.org/10.59075/tamsaal.v4i8.183*

ABSTRACT

This study examines the historical, political, social, and intellectual background of Qurratulain Hyder's era and its influence on her literary consciousness. It explores major developments in the Indian subcontinent, including British colonial rule, the War of Independence of 1857, political awareness, reform movements, nationalism, and progressive thought. The study also focuses on Hyder's intellectual and cultural upbringing, her extensive reading, interest in history, philosophy, music, and the arts, and her travels, which broadened her cultural and literary vision. Particular attention is given to Aag Ka Darya as a significant expression of her historical and cultural consciousness. Her fiction reflects the interaction of tradition and modernity, history and imagination, and local and global cultures. The study concludes that Qurratulain Hyder's distinctive literary vision developed through the convergence of her historical awareness, intellectual inheritance, cultural experiences, and engagement with the changing social and political realities of her time.

OPEN ACCESS

© 2026 The Authors, Published by ULLR. This is an Open Access Article under the Creative Common Attribution (CC-BY 4.0)

ہندوستان کی تہذیب اور تہذیبی روایات دنیا میں شاید سب سے پرانی ہیں۔ اسی طرح ہندو مذہب بھی دنیا کے تمام زندہ مذاہب میں قدیم ترین ہے۔ بنیادی طور پر ہندو ازم ایک اخلاقی روایات کا مجموعہ ہے جو امن رواداری، عدم تشدد اور انسان

دوستی پر مشتمل ہے۔ ہندوازم ہو یا بدھ ازم اسے ایک اخلاقی روایات کے مجموعے سے مذہب بننے میں، کئی ہزار سال لگے۔ اس دھرتی کے باسیوں کے سبزی خور ہونے کا تعلق بھی ان کی کسی نفسیاتی کمزوری سے نہیں بلکہ کسی جاندار کو نہ مارنے کی مضبوط اخلاقی روایت سے جڑا ہوا ہے۔

ہندوستان دریاؤں کی سرزمین ہے جہاں سرسبز پہاڑ ہیں، جن میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں موجود ہیں، لہلہاتے کھیت، سرسبز و شاداب میدان، پہاڑ، ندیاں نالے، جھیلیں اور چشمے اس کی خوش حالی کی علامت تھے۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کو اس کی خوش حالی اور امن پسندی کی پاداش میں، دنیا بھر کے جنگی سورماؤں کی طرف سے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے جب جی چاہا، اس عظیم الشان ملک پر چڑھ دوڑے اور اسے روندتے رہے۔ افغانی، وسط ایشیائی، عرب، ایرانی اور حتیٰ کہ یورپین حملہ آور اس کی تاریخ، ادب، فلسفہ اور تہذیب کو تاراج کرتے رہے اور یہ دھرتی خاموشی سے ہزاروں سال تک یہ ظلم سہتی رہی۔

کبھی کسی ہندوستانی نے کشور کشائی یا لوٹ مار کی خاطر کہیں جا کر حملہ نہیں کیا۔ اس کی اخلاقی روایات اور تہذیبی اثاثہ اتنا مضبوط تھا اور اس میں اتنی تازگی اور کشش تھی کہ تاراج ہو کر بھی ہر آنے والے توسیع پسند لٹیرے کو اس کی پر سکون گود میں پناہ لینی پڑی۔ ان لٹیروں میں ہر خطے اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے جو یہاں آیا اسی رنگ میں رنگتا گیا اور اور شاندار تہذیب کے وسیع دامن میں اپنے آپ کو لپیٹتا گیا۔

دنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلے میں ہندومت یا بدھ مت ایک سادہ یا اکہرا مذہب نہیں تھا، بلکہ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے تابع ایک لچکدار مذہب تھا، جہاں آپ کو اجازت ہے کہ آپ کسی ایک دیوتا کو مانیں اور دوسرے کو نہ مانیں، یہ آپ کی پسند، ذہنی اور نفسیاتی تشفی اور حالات و حوائج کی موزونیت پر منحصر تھا۔ یہاں آنے والے مختلف لوگ اسی کے رنگ میں رنگتے چلے گئے اور یہ سماج بڑی شانتی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی رواداری کا یہ دور جاری رہا، جہاں صدیوں تک مسلمان اقلیت، بڑے آرام و سکون کے ساتھ ایک بڑی ہندو اکثریت پر حکمرانی کرتی رہی اور روحانیت اور خانقاہی نظام کی وجہ سے ہندوؤں کو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوا۔ سخت ذات پات میں بٹے ہوئے ہندو معاشرے میں نچلی ذاتوں کے افراد کو اسلامی مساوات اور بھائی چارے کے درس میں کافی طمانیت محسوس ہوئی اور صوفیا کے زیر اثر وہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔

یہاں کے باشندے صدیوں تک یہاں کی بادشاہتوں کو برداشت کرتے رہے اور ان کے وعظوں کے تابع بادشاہوں کو بھی خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی اطاعت کرتے رہے۔ حال آں کہ صدیوں قائم رہنے والی ان بادشاہتوں نے لوگوں کو شہزادوں کی آپسی لڑائیوں کے قتل و خون کے علاوہ کچھ نہ دیا۔ پورے مغل ایرا کو دیکھ لیں، سوائے چند مخصوص طرح کی تعمیرات کے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔

اس خطے کے حقیقی باشندوں پر جن کے رنگ سانولے، ناک چپٹے اور قد چھوٹے تھے ہر ظلم سہتے رہے، ماریں کھاتے رہے اور لڑتے مرتے اس وسیع خطے کے دور دراز علاقوں میں آج بھی غریب الوطنی اور بے گھری کا عذاب جھیل رہے ہیں۔

آج کا ہندوستان، ویدوں کا ہندوستان نہیں بلکہ ان حملہ آوروں کا ہندوستان ہے، آج کا ہندو ازم ویدک عہد کی اخلاقی روایات کا امین نہیں بلکہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر گیا ہے جسے مختلف حملہ آوروں نے، خاص طور پر آریاؤں نے بالکل مختلف شکل دے دی اور پورے معاشرے کو نفرت کی بنیاد پر ذات پات کے سخت قوانین میں جکڑ دیا اور اس جکڑ بندی میں اس خطے کے حقیقی باشندے سب سے زیادہ متاثر ہو کر راندۂ درگاہ ہوئے اور اچھوت کہلائے۔ ان اچھوتوں کے ساتھ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور رشتے ناطے بنانا سماجی طور پر ایک ناقابل معافی جرم قرار دے دیا گیا۔

یہ وہ خطہ تھا جو دنیا میں علم وادب اور فلسفے کا عظیم الشان مرکز تھا، جہاں گنت ودیا(ریاضی)، منطق،قانون،طبیعات،الٰہیات،علم عناصر، صرف ونحو،، اخلاقیات،اداکاری، کیمیا گری،رقص، فن مصوری، فن موسیقی اور سپاہ گری کے علاوہ بہت سے دیگر علوم بھی سکھائے جاتے تھے۔جہاں، شراوستی، ایودھیا اور ٹکشلا جیسے علمی،ادبی اور روحانی مراکز لوگوں کو، زندگی کرنے کے لیے نہ صرف علوم سکھا رہے تھے بلکہ زندگی کے بنیادی سوالات کے جوابات بھی دے رہے تھے۔ اس علمی وادبی ترقی کی دھوم پوری دنیا میں مچی ہوئی تھی۔ اس عہد میں یونان کے علاوہ اگر کسی خطے میں علم کے سوتے پھوٹتے تھے تو یہ ہندوستان کی ہی سرزمین تھی۔یہی وجہ تھی کہ سکندر اعظم اپنے استاد ارسطو کے کہنے پر اپنے ساتھ علماء اور فضلاء کی ایک بڑی تعداد لے کر ٹکشلا آیا تھا اور جاتے ہوئے علوم وفنون کے دریا سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

جوں جوں ، توسیع پسند، چور لٹیرے اور ڈاکو، ہوس اقتدار اور دولت کی چاہ میں آتے رہے یہ خطہ تاراج ہوتا رہا۔ یہاں کے مسلمان بادشاہوں نے،ہندوؤں کے ساتھ متعصبانہ رویہ نہیں اپنا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو سماجی طور پر قریب لانے اور ایک مشترکہ ثقافت کی چھتری تلے ،سب کو زندگی گزارنے کی طرف مائل کیا۔ مگر اس سب کے باوجود اس طرح کی بادشاہتوں کی تمام تر قباحتیں ان کے ساتھ بھی جڑی ہوئی تھیں۔ہندوستان کے پورے وسائل کس بات پر خرچ ہو رہے تھے؟ اگر ہم اس سوال پر غور کریں تو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی رہائش گاہ کے طور پر محفوظ اور مضبوط قلعے تعمیر کیے جہاں شہزادے، شہزادیاں ، بیگمات ، نوکر چاکر، خواجہ سرا اور کنیزیں رہائش پزیر تھے۔ان رہائشی قلعوں کے ساتھ بادشاہ سلامت کے نماز پڑھنے کے لیے ایک جامع مسجد تعمیر کرلی جاتی تھی۔ قریب ہی بادشاہ اور ان کے خاندان کے افراد کے گھومنے پھرنے کے لیے پرفضا باغات تعمیر کیے جاتے تھے،جہاں وہ شام کو سیر کرنے چلے جاتے تھے۔یا پھر اپنی محبوباؤں کے لیے کوئی یادگار تعمیر کر دی اور یا پھر اپنی زندگی میں ہی اپنے لیے اپنے مقابر بھی تعمیر کروا لیے۔ اس کے علاوہ کوئی کسی قسم کی تعمیرات دیکھنے کو نہیں ملتیں۔کوئی سڑکیں،(سوائے شیر شاہ سوری کی جرنیلی سڑک کے) کوئی ہسپتال، کوئی تعلیمی ادارے نہیں بنائے جاتے تھے،پورے وسائل راگ رنگ کی محافل منعقد کرنے،اور جھومتے ہوئے قیمتی جواہرات لٹانے میں خرچ ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کچھ بچتا تھا تو وہ آپسی جنگوں کی نذر ہو جاتا تھا اور بے چارے عوام سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔خوش حالی کا صرف ایک راستہ تھا، ظل الٰہی کی خوشی، خوشامد اور خوش نودی۔ لاہور کا شاہی قلعہ اور دلی کی جامع مسجد اور لاہور کا شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد جیسی مثالیں ہر مطلق العنان حکمران کی طرف سے دیکھی جا سکتی ہیں۔لوگ بے چون وچرا ظل الٰہی کی اطاعت کو اطاعت خداوندی سے تعبیر کرتے اور خاموشی سے گردنیں جھکائے، گردن زدنی تک زندگی گزارتے رہتے تھے۔

انگریزوں کی آمد سے ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، انگریز اپنی چالوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے ، لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر گامزن تھا اور آہستہ آہستہ اس سرزمین پر اپنے پنجے گاڑ رہا تھا۔وہ اپنے ساتھ عیسائی تبلیغی مشنری بھی لایا تھا، جو نچلی جاتی کے صدیوں کے پسے ہوئے اور ذلتوں کے مارے ہوئے لوگوں کو اپنی خوش نما ترغیب سے اپنی طرف مائل کر کے تبدیلیٔ مذہب جیسا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ ہر مذہب پر نہ صرف اس طرح کے حملے کر رہا تھا بلکہ ان کے درمیان نزاع کا باعث بننے والے تضادات کو ہوا دے کر اپنی سرپرستی میں امن وسکون سے رہتے ہوئے معاشرے میں لڑائیاں جھگڑے، دنگے، فساد اور نفرتوں کے بیج بو رہا تھا۔

انگریز صنعتی انقلابات کر کے، مسلح ہو کر بندوقیں اور توپیں لے کر اور گاڑیوں پر سوار ہو کے آیا تھا اور ہم تیر اور تلوار لے کر گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ زیور تعلیم سے آراستہ تھا اور اپنی تجارت اور پیداوار کے اپنی سرحدوں میں گھٹتے ہوئے دم سے تنگ آکر

،اپنی دیو ہیکل مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خام مال لوٹنے اوراور اپنے تیار مال کے لیے منڈیوں کی تلاش میں کالونیل ازم، جیبا ایڈ ونجپر کر رہا تھا۔ دنیا کا ہر غریب اور پسماندہ ملک کسی نہ کسی سامراجی ملک کا شکار بن رہا تھا۔ انھوں نے یہاں کی حقیقی زمینداریاں اور جاگیرداریاں، بحق سرکار ضبط کر لیں، لوگوں کے درباروں سے منسلک مراعات اور وظائف بند کر دیے اور مقامی صنعتوں خاص طور پر کپڑے کی دستکاری کی صنعت کو برباد کر دیا جو معیار اور مقدار کے حوالے سے ان سامراجی صنعتوں کا مقابلہ نہ کر سکیں اور آہستہ آہستہ دم توڑ گئیں۔ ان دستکاریوں کی بندش سے ایک بڑا طبقہ بیروزگار ہو گیا۔ جاگیروں کے مالک سڑکوں پر آ گئے اور فن کار، ادیب اور شاعر فن کی سرپرستی چھن جانے اور ناقدری سے فاقوں مرنے لگے۔ کسان اپنی فصلوں کے اچھے معاوضے سے محروم ہو گیا اور اوپر سے بھاری لگان ادا کرتے کرتے، خون نچڑی ہوئی زندہ لاشوں کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔

کسی بھی ملک کا جاگیردار طبقہ اپنی مراعات کے چھن جانے پر مزاحمت ضرور کرتا ہے مگر وہ اقتدار کے ایوانوں سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ موقع پرستی کے ذریعے جتنی جلدی ممکن ہو اپنی جگہ بنا کر، پھر سے اقتدار کا حصہ بن جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شامل ہونے والے سبھی لوگ وہ تھے، جو انگریزوں کی ان پالیسیوں کے متاثرین تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جاگیردار طبقہ تاریخ کے میدان میں کسی بھی تحریک کی قیادت کرنے اور اسے اپنے منطقی انجام تک پہنچانے سے عاری ہوتا ہے۔ حقیقی تبدیلی کے لیے محنت کش طبقے کو اپنی قیادت تحریکوں کے اندر سے خود تعمیر کرنی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر انقلابات ہوتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اس دور کی سیاسی، سماجی اور معاشی چیرہ دستیوں کا اجتماعی انقلابی اظہار تھا، مگر یہ سب لوگ مشترکہ نصب العین ہونے کے باوجود ایک دھاگے میں سیاسی و نظریاتی طور پر پروئے ہوئے نہیں تھے اور پھر ان کی قیادت اس متاثرہ جاگیردار طبقے کے ہاتھوں میں تھی جو اسے اپنے تاریخی طبقاتی کردار کی وجہ سے منزل مقصود پر نہ پہنچا سکا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریز مکمل طور پر پورے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ انیسویں صدی کا اخیر اور بیسویں صدی کا آغاز برصغیر کے استحصال کا بدترین دور تھا۔ جہاں مقامی صنعتیں بند ہو گئیں اور انگریزوں کے قائم کردہ کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگلنے لگیں۔ مقامی لوگوں پر تعلیم، روزگار اور ترقی کے دروازے بند ہو گئے اور ہر طرف افراتفری اور معاشی لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ ایک زرعی معاشرے کی ترقی کا تمام تر دارومدار خوش حال کسانوں پر ہوتا ہے مگر برصغیر کے کسانوں کی فصلوں کی قیمت کے فیصلے کہیں اور ہونے لگے جس سے کسان کی فصل پر آنے والی لاگت بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ رہی سہی کسر لگان اور دیگر ٹیکسوں نے پوری کر دی۔ یہاں سے خام مال کو لوٹ کر، اسی مقصد کی خاطر بچھائی گئی ریل کے ذریعے، بندرگاہوں میں منتقل ہونے لگا اور وہاں سے دیو ہیکل بحری جہازوں کے ذریعے برطانیہ پہنچایا جانے لگا۔ یہاں، ریل بچھائی گئی، کارخانے قائم کیے گئے مگر نہ تو ریل کا مقصد ہندوستان کو ترقی دینا تھا اور نہ ہی بنیادی صنعتی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے کارخانے بنائے گئے بلکہ ان کا مقصد یہاں سے پٹ سن، چائے، کپاس اور گرم مصالحوں کو لے جانا اور اپنا تیار مال ہندوستان کی بڑی منڈی میں فروخت کرنا تھا، جس سے ہم ایک منڈی کی معیشت بن کر رہ گئے۔ اس معاشی ہلچل میں بڑی بڑی سماجی تبدیلیاں آئیں اور ان کارخانوں، بندرگاہوں اور ریلوے میں کام کرنے والے مزدوروں کے ایک نئے طبقے نے جنم لینا شروع کیا۔ یہ نیا پرولتاریہ کہیں کہیں اپنی اجتماعی طاقت کا اظہار کر رہا تھا۔ اور کارل مارکس کے بقول، وہ ریلوے لائن جو خام مال کی لوٹ کھسوٹ کے لیے بچھائی گئی تھی ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اس پرولتاریہ کو ایک رسی میں پرو کر ایک اجتماعی قوت بنا رہی تھی۔

جہاں دنیا بھر میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو رہا تھا وہیں ہندوستان میں مختلف علاقوں میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی مقامی بغاتوں کو کچلنے کے لیے نئی جاگیرداریاں پیدا کی جا رہی تھیں۔ بڑے بڑے جاگیردار پیدا ہو رہے تھے اور بڑی بڑی درگاہوں

کے گدی نشین ان غداریوں اور انگریزوں کی کاسہ لیسی کے طفیل بڑے بڑے انعامات واعزازات پارہے تھے۔ سماج اور سماجی ترقی آگے جانے کی بجائے یا تو جمود کا شکار تھی یا پیچھے کی طرف جارہی تھی۔

انگریزوں نے استحکام حاصل کرنے کے بعد یہاں سماجی تبدیلی کے لیے باقاعدہ ذہن سازی شروع کردی۔ فورٹ ولیم کالج کے نامکمل ایجنڈے پر کام شروع کر دیا گیا۔ انگریزوں کے قائم کردہ ادارے، فورٹ ولیم کالج ہو یا دلی کالج یا پھر گورنمنٹ کالج لاہور اور انجمن پنجاب، ان سب کے مقاصد تعلیمی سے کہیں زیادہ سیاسی تھے۔ ان اداروں کے مقاصد میں لوگوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ انگریز کی تعلیم، اس کا لباس، اس کی ثقافت اور اس کی اقدار ہندوستان کے مقابلے میں سپیریئر ہیں۔ وہ کتابیں تخلیق کر رہے تھے، تراجم کرا رہے تھے، موضوعاتی نظمیں لکھوا رہے تھے، مشاعرے منعقد کر رہے تھے اور لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کی دھاک بٹھا رہے تھے۔

اسی دوران دونوں عظیم جنگیں ہوئیں جس سے برطانوی معیشت کی اپنی کمر ٹوٹ گئی اور جنگوں کا سارا خرچہ ہندوستان کے سسک سسک کر زندگی گزارتے عوام سے نچوڑا جانے لگا۔ اس عمل سے سماجی بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ لوگوں میں سیاسی اور سماجی شعور بھی بیدار ہو رہا تھا۔ سیاسی جماعتیں بن رہی تھیں اور سماجی اور مذہبی اصلاح اور احیاء کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے اخیر سے شروع ہونے والے سیاسی اور سماجی شعور نے اب باقاعدہ ایک شکل اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ کانگریس کے بعد اب مسلم لیگ بھی معرض وجود میں آچکی تھی۔

۱۹۰۵ء میں نمو پانے والے انقلاب نے ۱۹۱۷ء میں لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں باقاعدہ ایک منظم انقلاب برپا کر دیا تھا، جس نے پوری دنیا کے محنت کشوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس کے اثرات پوری دنیا کا پرولتاریہ محسوس کر رہا تھا اور علم وادب، سماج اور سیاست میں اپنا ایک کردار ادا کر رہا تھا۔ خاص طور پر یورپ میں اس تحریک کی تپش بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی اور نتیجتاً پوری دنیا سے یہاں آکر تحصیل علم کرنے والے طلباء بھی متاثر ہو رہے تھے اور وہاں سے اس کے اثرات پوری دنیا میں پھیل رہے تھے۔ ہندوستان میں بھی یہ پڑھا لکھا طبقہ ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے جمع ہو کر بڑی تیزی سے ترقی پسند نظریات کی ترویج کر رہا تھا، جس سے ہندوستانی شاعری، ناول اور افسانہ بھی متاثر ہو رہا تھا، جس سے بہت معیاری ادب تخلیق ہونے لگا تھا۔

سماجی اور مذہبی اصلاح اور احیاء کی تحریکیں بھی نئی کروٹ لے رہی تھیں اور ان میں موجود رجعتیت، ایک قدم آگے بڑھ کر قومی تشخص تلاش کرنے لگی تھی۔ ان تحریکوں میں کئی طرح کی سوچ تھی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو تعلیمی ترقی کے ذریعے اصلاح چاہتے تھے اور مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں اپنا مستقبل دیکھتے تھے، دوسرے سماجی شعور اور تہذیبی ومذہبی احیاء وترقی کے ذریعے اصلاح احوال چاہتے تھے اور تیسری طرف سیاسی اصلاح پسندی کے نام پر پورے ہندوستان میں بالعموم اور بنگال اور مہاراشٹر میں بالخصوص، درمیانے طبقے کے نوجوانوں کے ایسے گروہ منظم ہو رہے تھے جو انقلابی کاروائیوں کے ذریعے غیر ملکی سامراجیوں کو ملک سے نکالنا چاہتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو تعلیمی اور تہذیبی احیائیت کا قائل تھا مگر ساتھ ہی اس کو وطن کی آزادی سے بھی جوڑ رہا تھا۔

یہ مختلف طرح کی سوچیں تو پنپ رہی تھیں مگر کسی کے پاس بھی تبدیلی کا کوئی مکمل لائحۂ عمل نہیں تھا اور تقریباً سب کی تان سرمایہ دارانہ جمہوریت پر آکر ہی ٹوٹتی تھی، سوائے سوشلسٹ انقلاب سے متاثر ہونے والے نوجوانوں کی تحریکوں کے جو ابھی تک ایک انقلابی پارٹی تعمیر نہیں کر پائے تھے اور کوئی بڑی انقلابی لیڈرشپ بھی منظر عام پر نہیں آپائی تھی مگر ان کی سوچ باقی گروہوں سے مختلف اور مکمل تبدیلی کی تھی۔

جب تک انگریز برصغیر میں نہیں آئے تھے تو ہندوستانی رعایا سوچنے سمجھنے سے عاری تھی۔ انھیں مطلق العنانی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اور وہ صدیوں سے ظل الٰہی کے آگے کورنش بجالاتے، جھکتے جاتے تھے۔ اب انگریزوں کی ذہن سازی کی کوششوں کے نتیجے میں انھیں مطلق العنانی میں کیڑے نظر آنے لگے تھے۔ اپنے مذہبی خیالات اور تہذیبی اقدار کو خطرے میں دیکھ کر انھیں قرین از عقل بنانے کے لیے مذہبی اصلاح پسندی اور تہذیبی احیاء پر زور دینا پڑ رہا تھا۔ ہندو اس مقصد کے لیے قدیم ویدوں کے عہد کو سنہرا دور کہتے تھے اور اس دور کی اعلیٰ اقدار کے گن گاتے تھے جب کہ دوسری طرف مسلمان بھی اپنی مذہبی زوال پذیری کو اعلیٰ اسلامی اقدار سے روگردانی کا نتیجہ قرار دیتے تھے اور خلافت راشدہ کے زمانے کو ہی حقیقی اسلامی دور قرار دیتے تھے اور پھر اس کو حقیقی جمہوری سوچ کا آئینہ دار بھی قرار دیتے تھے۔

سماجی ارتقاء میں ہندو اور مسلم دونوں مستقبل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہندو بھی اصلاح واحیاء کی فکر میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب معاشرے کو واپس بادشاہتوں یا مطلق العنانیت کی طرف نہیں لے جایا جا سکتا بلکہ آنے والے وقتوں میں مغربی طرز کی جمہوریت میں ہندوؤں کے علاوہ، ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام اور مذاہب کو، جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں ملک سے نکال کر کوئی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا اور مسلمان بھی یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب ایک چوتھائی اقلیت کے ساتھ تین چوتھائی ہندو اکثریت پر بادشاہت کرنے کا سنہرا دور شاید اب کبھی واپس نہیں آئے گا لہٰذا اب ایک جگہ اکٹھے رہنے کے لیے اور غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک ہونے کی سوچ ابھر رہی تھی۔ یہ سوچیں مختلف سمتوں میں نکل کر ایک گولائی میں سفر کرتی ہوئی اسی ایک نقطے پر اکٹھی ہو رہی تھیں۔ ایک ایسی سوچ جنم لے رہی تھی جس سے تمام مکتبِ ہائے فکر، قومی آزادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سجاد ظہیر، اپنے ایک مضمون، ''تحریک کا فکری وتہذیبی پس منظر'' میں اس صورت حال پر یوں رقم طراز ہیں:

> "خیالات، نظریے، فلسفیانہ تصورات وعقائد، انسان کے ذہن میں اس کے مادّی
> حالاتِ زندگی اور اس کی بنیاد پر پیدا ہونے والے اجتماعی رشتوں اور مختلف قسم کے
> (سیاسی، مذہبی، تہذیبی وغیرہ) اجتماعی سماجی عمل اور ان سے پیدا ہونے والی زندگی کے
> عکس ہیں۔" 1

ہندوؤں میں بھگتی اور برہمو سماج اور آریہ سماج جیسی تحریکیں اور مسلمانوں میں علی گڑھ تحریک، انجمن حمایت اسلام اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جیسی تحریکیں اور اس کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی زبان وادب میں اصلاح اور احیاء کی تحریکیں، جدید مغربی افکار کے مقابلے میں اپنے آپ کو جدید بنانے اور اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی بقا اور ارتقاء کے لیے کام کر رہی تھیں۔ سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی اسلام کی عالمگیریت کی سوچ اس رحجان کی نمائندگی کر رہی تھی کہ اسلام، در اصل وہ نہیں ہے جو آج ہمارے سامنے ہے بلکہ ہندوستان کے بادشاہوں نے اس کی شکل بگاڑ دی ہے اور اسلام ملوکیت کے ہاتھوں اس نہج کو پہنچا ہے۔ اور پھر سر سید احمد خان کی پوری کی پوری تحریک جو مہذب اخلاقیات کا درس تھی اپنے مضامین میں اسی سوچ کو منعکس کر رہی تھی کہ آج کی مغربی ترقی کا سبب وہی اسلامی اقدار ہیں جنھیں ہم نے تو چھوڑ دیا ہے مگر اہل مغرب نے ان اقدار کو اپنا لیا ہے جس سے وہ ترقی کی معراج پر ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد پورے ہندوستان میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے۔ اسی وقت تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت، سول نافرمانی کی تحریک اور سوشلسٹ نظریات سے مسلح نوجوانوں کی سیاسی اور مسلح جدوجہد نے، سماج میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

عینی آپا کا تعلق جس طبقے سے تھا وہاں وہ فراغت پائی جاتی ہے جہاں چیزوں کی کیفیت وماہیت پر غور کیا جا سکتا ہے۔ فرصت کے وہ لمحات میسر آتے ہیں جن میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ غور وفکر اور مطالعہ جس قسم کے حالات کا متقاضی ہے وہ دستیاب تھے۔ اور پھر گھر، محض ایک جاگیردارانہ کلچر ہی نہیں رکھتا بلکہ علم وادب کی نہایت قد آور شخصیات والدین کی شکل میں سر پہ سایہ فگن تھیں۔ صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ اوائل عمری میں ہی لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ ملکہ بھی نسل در نسل ''تہذیبی بہن'' سے عینی آپا کو منتقل ہوا۔

ہر طرح کا ادب، ہر خطے کا ادب اور کئی زبانوں کا ادب ان کے زیر مطالعہ رہا۔ انگریزی، عربی، ترکی، فارسی، روسی ادب نہ صرف پڑھا بلکہ بہت سی زبانوں سے اردو میں تراجم بھی کیے۔ اپنے دور کا تمام کلاسیک ادب ان کی نظروں سے گزرا۔ "قرۃ العین حیدر" جو بذات خود ایک کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں، ان کے ناول ''آگ کا دریا'' اور ''آخر شب کے ہم سفر'' جو ہمارا موضوع ہیں، اپنے دور کے حساب سے جہاں اردو ناول کی بہت بڑی اور اعلیٰ مثال موجود نہیں تھی، (سوائے امراؤ جان ادا کے)، جس پر کسی قسم کا فخر کیا جا سکے۔ زبان کے ارتقائی سفر میں ابتدا کے طور پر تو ان ناولوں کو دیکھا جا سکتا تھا مگر انھیں، اس وقت کے عالمی ادب کے مقابلے میں، اس معیار پر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ "قرۃ العین حیدر" ہی تھیں، جنھیں ایسے حالات میسر تھے، فکر ونظر کے وہ زاویے سامنے تھے، علم اور شعور کا ایک خزانہ وراثت میں ملا تھا اور شاید اب اردو زبان بھی اس قابل ہو گئی تھی کہ اس میں اس طرح کا بڑا ناول تخلیق کیا جا سکے۔ دنیا کے تمام بڑے شاہکار ادب پارے ایک ہیجانی اور بحرانی کیفیت میں ہی وجود میں آتے ہیں اور شاید اس وقت ہندوستان واقعی ایک ہیجانی کیفیت سے دوچار تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ کا شعور، زبان کا معیار اور سماجی حالات اس قابل تھے کہ اس میں واقعی ایک کلاسیک تخلیق ہو سکتا تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا بقول ڈاکٹر جمیل جالبی۔

> "واللہ انھوں نے بہت پڑھا تھا اور بہت پڑھتی رہتی تھیں۔ کسی حد تک فارسی کلاسیک بھی، مگر انگریزی اور فرنچ اور خاصا جرمن اور اطالوی کلاسیک بھی۔ نوکری کے ساتھ مسلسل کئی بیرونی زبانوں کا اتنا ادب پڑھنا ان کے سبھی جاننے والوں کو حیرت میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ ان زبانوں کا کلاسیک ہی نہیں عصریات بھی خوب پڑھتیں۔ ان کے سب جاننے والے حیرت کرتے کہ وہ اتنا کب پڑھتی ہیں اور ان سے پوچھتے بھی۔ جواباً وہ مذاق اڑاتیں اور بات بڑھے تو دوسرے دن کتابیں لا کے دکھا دیتیں۔"2

"قرۃ العین حیدر" کے سماجی اور معاشی حالات دیکھیں اور ان کے گرد وپیش پر نظر دوڑائیں اور انھیں حاصل مادی وسائل اور مواقع کو نظر میں رکھیں تو یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ انھوں نے اتنا مطالعہ کرتے ہوئے جدید عالمی ناول، اس کی ہیئت، تکنیک اور بنت پر نظر نہیں ڈالی ہو گی۔ شعور کی رو اور فلیش بیک کی تکنیک کو نہیں دیکھا ہو گا مگر وہ اتنی قد آور شخصیت ہیں اور پھر مزاجاً بھی کچھ کڑواہٹ یا روکھا پن ہونے کی وجہ سے کسی کو ان کی اس بات سے اختلاف کی جرأت نہیں کہ انھوں نے ورجینیا وولف کو آگ کا دریا لکھنے کے بعد پڑھا۔

اس بات کو اگر ایک اور زاویے سے دیکھیں تو اس بات پر یقین کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ کیا خیالات اور نظریات کہیں سے اترتے ہیں؟ کسی بھی شخص کے مادی حالات ہی ان خیالات اور نظریات کو جنم دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ممکن نہیں کہ "قرۃ العین حیدر" نے واقعی اردو میں از خود یہ تکنیک استعمال کی ہو گی، جسے ایک کلاسیک بننے اور ایک کلاسیک تخلیق کرنے کے تمام تر مادی

ذرائع اور حالات میسر تھے۔یہاں دانش اور فہم وادراک کے ساتھ ساتھ، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات اور عالمی تناظر اس بات کو مکمل سپورٹ فراہم کرتے ہیں کہ واقعتاً،اردو میں یہ تکنیک انھوں نے از خود سب سے پہلے استعمال کی ہے۔

"قرۃ العین حیدر " کا تہذیب وفن سے یہ لگاؤ دراصل ان کی ذات کا جزو ہے۔ وہ صرف ایک نثر نگار ہی نہیں ہیں بلکہ شاعرہ بھی ہیں، مصورہ بھی ہیں، موسیقی کا شغف بھی رکھتی ہیں، فلسفہ دان بھی ہیں تاریخ دان بھی ہیں، مغربی تہذیب سے متاثر بھی ہیں اور مشرقی اقدار کا دامن بھی نہیں چھوڑنا چاہتیں۔ وہ ایک مرنجان مرنج شخصیت ہیں اور فنون کی اسی آمیزش اور رچاؤ سے ہی اس کی شخصیت تعمیر ہوئی ہے۔

اسے موسیقی کا محض شوق ہی نہیں بلکہ وہ موسیقی کے رموز واسرار بھی جانتی ہیں، راگوں کے صرف نام یاد نہیں بلکہ ان کی بنت اور ان کی گائیکی کے اوقات اور ان کی تاثیر بھی سمجھتی تھیں۔انھیں صرف سننے کا شوق نہیں بلکہ انھیں گانے کا شوق بھی تھا جس کا مظاہرہ وہ کئی نجی محافل میں کرتی رہتی تھیں۔انھیں صرف مشرقی موسیقی کا ہی علم نہیں بلکہ بے شمار انگریزی گانے بھی یاد تھے جس سے ان کی فن سے رغبت کا پتا چلتا ہے۔

"آگ کا دریا" سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"فضائے بسیط میں بھیروں، مالکونس،ہنڈول، میگھ، دیپک، سری کے دیو گرج رہے ہیں۔اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہوا میں پر پھیلاتی ہیں۔ جنگل کے پرندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھی اور دوست ہیں۔ ان کی آواز، ان کے رنگ اور ان کی چال کو رقص ونغمہ کے تخیل میں محیط کر لیا گیا ہے۔مور کھرج میں جھنکارتا ہے،پپیہا رکھب میں اپنی رٹ لگاتا ہے۔ بکری گندھار میں ممیاتی ہے۔ کلنگ مدھم میں پکارتا ہے۔کوئل کی کوک میں پنچم کا سر ہے۔ دھیوت گھوڑے کا ہنہنانا ہے۔ نکھاد ہاتھی کی چنگھاڑ ہے۔"3

اب اس اقتباس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا موسیقی اور اس کے رموز سے کتنا گہرا ربط ہے۔ یہ معمولی علم نہیں کہ کائنات میں موجود مختلف پرندوں اور جانوروں کی آوازوں کو موسیقی کے رموز پر قیاس کر لیا جائے بلکہ کسی موسیقی کے ماہر سے پوچھیں تو وہ بتائے گا کہ واقعی، بکری کا ممیانا، گندھار میں ہوتا ہے اور کلنگ مدھم میں پکارتا ہے۔

موسیقی میں ساتوں سروں کے نام ہیں:

پہلا سر: سا ہے جو کھرج کہلاتا ہے۔
دوسرا سر: رے ہے جو رکھب کہلاتا ہے۔
تیسرا سر: گا ہے جو گندھار کہلاتا ہے۔
چوتھا: ست ما ہے جو مدھم کہلاتا ہے۔
پانچواں سر: پا ہے جو پنچم کہلاتا ہے۔
چھٹا سر: دھا ہے جو دھیوت کہلاتا ہے۔
ساتواں سر: نی ہے جو نکھاد کہلاتا ہے۔

ان کی آوازوں اور پیچ پر غور کریں اور ان جانوروں اور پرندوں کی آوازیں سنیں تو "قرۃ العین حیدر" کے مشاہدے کی گہرائی اور علم کی وسعت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر صرف موسیقی کے رموز سے ہی واقف نہیں ہیں بلکہ جب رقص کی بات ہوتی ہے تو مشرقی رقص کے متعلق سارا علم، چند جملوں میں سمٹ کر یوں ہمارے سامنے آجاتا ہے:

"مردنگ زور زور سے بجتی رہی۔ سندھیا ٹانڈو ناچتا ہوا منڈپ کے وسط میں آ گیا۔ اس نے شو کی مانند رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے۔ اس نے آٹھوں رس دکھلائے۔ یہ وشنو کا شرنگار رس ہے۔ یہ اندر کا ویر ورس۔ یہ یم کا کرونا۔ یہ رودرا کا رودر رس۔ یہ کال کا بھیانک رس ہے۔ یہ گندھرو کا اوبھت رس۔ یہ شانت رس ہے۔ یہ شو کا رقص ہے۔"4

"قرۃ العین حیدر" کی شخصیت میں تمام فنون جمع ہو کر اس کی تہذیبی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف رقص و موسیقی کے علوم سے استفادہ کیا بلکہ آرٹ جیسے فن لطیف میں بھی لطافت حاصل کی۔ آرٹ سے انھیں محض رغبت ہی نہیں تھی بلکہ اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے تک گئیں اور اسی فن میں حصول کمال کا نتیجہ ہے کہ اپنی کتابوں کے سرورق خود پینٹ کرتی نظر آتی ہیں۔

"قرۃ العین حیدر" کے ہاں منظر نگاری کے جو مرقعے نظر آتے ہیں اور ان میں فن کی جو گہرائی ملتی ہے وہ ان کی آرٹ سے رغبت کا ہی نتیجہ ہے۔

"قرۃ العین حیدر" کے ادبی سرمائے میں موسیقی کا آہنگ بھی ہے اور قص کا والہانہ پن بھی، ان کے ہاں رنگوں کی رنگینی بھی ہے اور لکیروں کی بنت بھی۔ ان کے ہاں ہمیں فنون کا تمام تر توازن اپنے پورے وجود کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کی یہ انفرادیت محض اتفاق نہیں بلکہ ان کا یہ کمال فن، انھیں وہ تمام فکری اور فنی بنیادیں فراہم کرتا ہے جس سے وہ نہ صرف اپنے عہد میں بام عروج پر نظر آتی ہیں بلکہ آنے والے وقتوں کے لیے بھی ایک کلاسیک بن کر اپنے ایک خاص مقام پر کھڑی ہیں۔

"آگ کا دریا" میں رقص کے ضمن میں جس علمیت کا اظہار قرۃ العین حیدر نے کیا ہے محض ایک علم ہی نہیں اپنے اوپر وارد کیا ہوا ایک تجربہ ہے جسے روح تک محسوس کیا جا سکتا ہے:

"آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پنتالیس قسمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار قسمیں ہیں اور ہر قسم کی چوبیس علاحدہ علاحدہ شاخیں۔ ان گنت طرح کے لوچ اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہیں۔ جس طرح گائتری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جس طرح آرتی کے پردیپ میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناچ ہیں۔"5

"قرۃ العین حیدر" کی زندگی میں وسیع کینوس کی ایک اور بڑی وجہ ان کا سیر و سیاحت کا ذوق ہے، کہتے ہیں سفر وسیلۂ ظفر ہے اور پھر دنیا بھر میں سفر کرنا وہاں لوگوں سے ملنا، وہاں کی تہذیب و تمدن کا قریب سے مشاہدہ کرنا اور وہاں کی ثقافت اور تاریخ کو جانچنا اس پر مستزاد یہ کہ یہ تمام موضوعات ان کو مرغوب بھی تھے، ان کی وسیع النظری کا باعث بنے۔

"قرۃ العین حیدر کی یہ خصوصیت ہے کہ دوران راہ جو کچھ سامنے آتا ہے اس کو ایک بہترین مورخ، ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ سیاست دان اور جغرافیہ دان کی طرح دیکھتی ہیں اور اس کی تصویریں ایک ماہر مصور قلم کی طرح اتارتی جاتی ہیں۔"6

انھوں نے صرف سفر ہی اختیار نہیں کیا بلکہ بعض ملکوں کے بڑے دلچسپ سفر نامے بھی لکھے۔ ملکہ فرح دیبا کے ساتھ ایران میں قیام کے دوران "کوہ دماوند" جیسا سفر نامہ تخلیق کرنا ایک طرح کا کمال ہے۔ تہران، شیراز، اصفہان، مصفہ جہاں گئیں، رنگارنگی اور تنوع نے یقیناً ان کی تخلیقی خلاقی کو جلا بخشی۔ ایران کے شاہی خاندان کی وجاہت، ان کی روایات اور ایرانی ثقافت کو قریب سے دیکھا اور فارسی کے ذریعے ادب کی صدیوں پر محیط شاندار روایت کو کھنگالا۔ ایران کے ساحلوں کی وسعت نے ان کے خیالات کے کینوس کو وسیع کیا، جس سے ان کی علمیت میں نئی اٹھان پیدا ہوئی۔

"البرز کی گونجتی ہوئی چٹانوں پر سیمرغ پروں میں چونچ چھپائے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اور باخبر ہے کہ چند فرسنگ پر کوہ طالقان اور کیپسین کے درمیان پر اسرار جنگلوں، چراگاہوں میں وراجنے والا لال دیو بغلیں بجاتا ہے کہ ہفت خواں طے ہوئی اور سفید دیو، بالآخر مات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیر اسپ، گشتہ سپ، جاماسپ، مہر اسپ، ارجا سپ، اسفندیار رستم رہاز میں سپہ نہ بہرام رہ گیا۔ بڑی سخت نیند آرہی ہے۔"7

"جہان دیگر" میں امریکہ کا سفر نامہ لکھا تو شکاگو جیسے علمی مرکز اور اس کی روایات کو سمجھا، وہاں کی ثقافتی سرگرمیوں اور وہاں کے معروف تھیٹر کو دیکھا۔ فلوریڈا جیسے شہر میں رومانس کے قدرتی مناظر کا نظارہ کیا۔ ایریزونا کے گرم موسم کو محسوس کیا اور سرخ صحرا کو چھانا۔ سان فرانسسکو اور کیلی فورنیا کے قدیم وجدید ساکنان کی تاریخ اور ثقافت کا تنوع اور ادغام دیکھا۔

"قرۃ العین حیدر" نے مصر کا سفر بھی اختیار کیا اور انھوں نے یہ سفر برطانوی بحری جہاز ''کیلی ڈونیا'' کے ذریعے کیا۔ برطانیہ جاتے ہوئے راستے میں وہ قاہرہ گئیں۔ وہ کھلے سمندر سے جہاز سے ساحل تک ایک لانچ کے ذریعے گئے تھے۔ جہاں انھوں نے صحرا کا سفر کیا اور پھر دریائے نیل دیکھا اور مصر کی قدیم تاریخ کا مشاہدہ کیا۔ وہ اہرام مصر دیکھنے گئیں اور بادشاہوں کے مقابر دیکھے، شاہی دربار دیکھے اور ان کی شان وشوکت ملاحظہ کی۔ انھوں نے ابو الہول کا بھی مشاہدہ کیا اور مصر کی عظیم یونی ورسٹی جامعہ الازہر کا بھی نظارہ کیا۔

مصر کے سفر میں انھوں نے الف لیلیٰ کا سٹیج بھی دیکھا اور رقاصاؤں کا بیلی ڈانس بھی۔ مصر کا یہ مختصر سا سفر "قرۃ العین حیدر" کو مصر کی تاریخ سفر، تہذیب، فن تعمیر، ثقافت اور ان کے تمدن کے بارے میں بہت کچھ سکھا گیا۔ اس سفر میں اسے دوران سفر ایک شاندار کمنٹیٹر بھی میسر آیا جو ہر اہم جگہ کے بارے میں تبصرہ کرتا جاتا تھا جس سے چیزوں کو سمجھنا زیادہ آسان لگا۔ "قرۃ العین حیدر" کا تاریخ کا مطالعہ یہاں بھی کام آیا اور دو ایک مواقع پر ان کا لقمہ دے کر تاریخی واقعات اور شخصیات کی وضاحت کرنے کی وہ مبصر بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور مبصر کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کے ملک کی معروف گلوکارہ ام کلثوم کو صرف مصری ہی نہیں جانتے بلکہ انھیں بیرون مصر بھی جانا جاتا ہے۔

ان کے ان سفر ناموں میں ان کی طبیعت میں موجود شاعرانہ بہاؤ جگہ جگہ نظر آتا ہے، ان کی نثر بھی کہیں کہیں خواب ناکی کے عالم میں ہلکے ہلکے سرور کے ساتھ ہچکولے کھاتی ہوئی لگتی ہے، ان کے اسی طبعی میلان کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تصنیفات کے نام شعری مصرعوں پر ہی رکھے ہیں۔

"البرز کی گونجتی ہوئی چٹانوں پر سیمرغ پروں میں چونچ چھپائے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اور با خبر ہے کہ چند فرسنگ پر کاہ طالقان اور کیپسین کے درمیان پر اسرار جنگلوں، چراگاہوں میں وراجنے والا لال دیو بغلیں بجاتا ہے کہ ہفت خاں طے ہوئی اور سفید دیو بالا خر مات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیر اسپ، گشتہ سپ، جاماسپ، مہراسپ، ارجاسپ، اسفندیار رستم رہا زمین پہ نہ بہرام رہ گیا۔ بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔"8

سعودی عرب گئیں تو خانۂ خدا میں، حجر اسود کے بوسے لیے، طواف کعبہ کیا اور سرکار مدینہ کی بارگاہ میں حاضری دی۔ اور جدہ میں مطلق العنان بادشاہوں کے جبری صنفی تفاوت پر احتجاج بھی کیا اور افسوس بھی کیا۔ ترکی کی عظمت رفتہ کا مشاہدہ کیا اور عراق میں کربلائے معلیٰ کی زیارت بھی کی۔ قاہرہ میں مصر کی عظیم الشان تاریخ، قدیم عمارات اور ان کے اسرار و رموز کو سمجھا۔ جاپان جا کر ایک منظم اور جدید دنیا کا مشاہدہ کیا ہے۔ روس جا کر برف زار دیکھے، سبزہ زار اور صحرا دیکھے، صوفیوں کے مزارات، مجاہدوں کی یادگاریں، فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے اور مختلف تہوار اور میلے ٹھیلے ملاحظہ کیے۔ ان کی ان تمام تحریروں میں ایک جہان معنی آباد نظر آتا ہے۔

"اودھ نامہ" میں صالحہ صدیقی نے اپنے ایک مضمون بعنوان، اردو میں خواتین سفرنامے کی کہانی میں ان کے اسلوب اور اس کے لوازمات کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

"ان کا اسلوب بیان ہندوستانی اساطیر، قدیم روایتی قصص، داستانوں، صوفیوں، سنتوں کے روحانی وسیلوں، ہندوستانی تاریخ تہذیب و ثقافت کے ملے جلے عناصر سے ابھرتا ہے۔ وہ حال، ماضی، کے درمیان تحریری سفر طے کرتی رہتی ہیں۔ ان کی تحریر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے قاری کا مختلف علوم و فنون، ادبیات، مذہبی، صحائف، تاریخات، قدیم و جدید کی مختلف معلومات اور مختلف تصورات و توہمات سے واقف ہونا ضروری ہے۔"9

"قرۃ العین حیدر" کراچی سے کچھ عرصے کے بعد ۱۹۵۱ میں لندن چلی گئیں۔ دوستوں نے فیئر ویل پارٹی دی اور اخبار میں ان کے جانے کی اطلاع بھی دی گئی۔ وہاں وہ پاکستانی سفارت خانے میں شعبہ انفارمیشن میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہو گئیں۔ جب شریف الحسن دو ماہ کی رخصت پر کراچی گئے تو انھیں لندن کے پاکستانی سفارت خانے میں قائم مقام پریس اتاشی کے عہدے پر بھی کام کرنا پڑا۔ پاکستانی ہائی کمیشن سے ایک اختلاف کے باعث انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد وہ بی بی سی میں کام کرنے لگیں۔ انھیں ہفتے میں دو پروگرام کرنا ہوتے تھے۔ وہ بی بی سی میں کام کے سلسلے میں ایک کنٹریکٹ کی خواہش مند تھیں مگر وہاں اقربا پروری کے باعث وہ کنٹریکٹ انھیں نہ مل سکا، جس پر وہ لندن جیسے شہر میں ہونے والی اقربا پروری پر ہمیشہ حیران رہیں۔

لندن سے قرۃ العین مانچسٹر گئیں، ان کی عادت تھی کہ وہ جہاں بھی جاتیں وہاں کے لینڈ اسکیپ، رہن سہن اور تاریخ پر ضرور نظر ڈالتیں۔

مانچسٹر میں انھوں نے اپنی ایک تحریر میں اپنی منظر نگاری کو تاریخ اور فلسفے سے اس طرح مدغم کیا ہے کہ "آگ کا دریا" کی منظر نگاریوں اور تاریخ اور فلسفے کے ادبی ادغام کے لیے زمین تیار ہو رہی ہے:

> ”جنگلوں میں سلور بیچ اور ایش اور ہولی بیری سب برف سے لد گئے۔ سارا لینڈ اسکیپ ایک کرسمس کارڈ میں تبدیل ہو گیا اور رود بار کے دوسری طرف یورپ برف پوش تھا اور پیرس میں ”زیست پرستوں“ کے قہوہ خانے گرم اور روشن۔ کیا ہم سب زیست پرست نہیں ہیں؟ مغربی جرمنی میں گرم برادران کے فیری ٹیلز جیسے مناظر۔ کیا اسی جرمنی میں چھے سات برس قبلکنسٹر کشن کیمپ موجود تھے؟ ناقابل یقین! اور انھیں حسین جنگلوں اور وادیوں میں اور دلفریب شہروں میں وہ جنگ لڑی گئی تھی؟ ناقابل یقین! لیکن ہنیس کرسچین اینڈرسن کا ڈنمارک اور گرم برادران کا جرمنی اور نغمہ پرست اطالیہ اور وہ کنسٹر کشن کیمپ اور وہ فسطائیت اور وہ بمباری دونوں حقیقت تھے۔ چناں چہ یہ ثابت ہوا کہ فیری ٹیلز پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ضرور کرنا چاہیے، مجھے فیری ٹیلز پر یقین ہے۔“10

"قرۃ العین حیدر" نے اپنی لندن یاترا کے دوران ریجنٹ سٹریٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ سے صحافت کے شعبے میں ڈپلوما کرنے اور فرانسیسی زبان سیکھنے کے لیے باقاعدہ داخلہ لیا۔ انھوں انور جمال قدوائی کے توسط سے برٹش یونین آف جرنلسٹ کے صدر ہیری ٹرنر سے ملاقات کی، انھوں نے "قرۃ العین حیدر" کو ڈیلی ٹیلی گراف کے دفتر بھیجا اور انھوں نے کسی بڑے قومی اخبار میں رپورٹنگ کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے وہاں رپورٹنگ شروع کر دی۔

۱۹۵۵ء میں "قرۃ العین حیدر" ایک پولش بحری جہاز بٹوری کے ذریعے واپس کراچی آئیں اور واپسی پر راستے میں پڑنے والے یورپی ممالک اور عرب ممالک کی سماجی کیفیات، تاریخی واقعات اور تہذیب و تمدن کے شاندار نقشے کھینچے ہیں۔ انھوں نے سوائے، آسٹریلیا اور کچھ افرقی ممالک کے پوری دنیا کی خاک چھانی اور اس خاک سے ہی گلہائے رنگا رنگ تخلیق کیے ہیں۔

انھوں نے نہ صرف پوری دنیا گھومی بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی بھی خوب خاک چھانی۔ ان کے پاؤں میں ایک چکر تھا اور دل میں سیاحت کا ایک بیکراں جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا، جو انھیں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب لیے پھرا اور وہ اپنے محسوسات کو جیسا تھا ویسا قلم بند کرتی گئیں۔ ان کے ناولوں میں اپنی مٹی سے جو محبت نظر آتی ہے وہ انہی کا خاصا ہے۔ انھوں نے محض یہ سفر اختیار نہیں کیے بلکہ بعض جگہوں کو بسر کیا ہے اور ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ جذبات کے تلاطم میں بہتی چلی جاتی ہیں۔

اترپردیش کے ترائی کے جنگلات کی تاریکی سے ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسی ہوئی بستیوں تک ان کی نظر جاتی ہے۔ علی گڑھ کی خاک سے جنم لے کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آسودۂ خاک ہونے تک بہ امر مجبوری یا بصد شوق انھیں کہیں ٹک کر کم ہی بیٹھنا نصیب ہوا۔ والد صاحب دوران ملازمت جہاں گئے عینی کو بھی ساتھ ہی جانا پڑا۔

وہ جس شہر میں بھی گئیں اسے صرف دیکھا نہیں محسوس بھی کیا اور وہاں کی تمدنی زندگی، بود و باش، تہذیب، ثقافت، لوگ ان کے رویے ان کی سوچ کا انداز غرض کہ ہر پہلو سے مطالعہ کیا۔ چوں کہ انھیں فلسفہ، تاریخ اور ثقافت سے خاص لگاؤ تھا اس لیے وہاں کی تہذیبی زندگی کا نقشہ جابجا کھینچا ہے ان میں کسی طرح کا مصنوعی پن نہیں تھا بلکہ وہ جس چیز کو جیسے دیکھتیں اسی طرح بیان کر دیتیں۔ کہیں ایک انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے بنگال کے مقابلے میں لکھنو کا ذکر ہمیشہ زیادہ والہانہ انداز میں کیا ہے تو ان کا کہنا تھا کہ ظاہر ہے لکھنؤ میں میرا قیام زیادہ رہا اور وہاں کی کلچرل زندگی کو میں نے زیادہ

قریب سے دیکھا ہے اس لیے یہ فطری بات ہے کہ لکھنؤ کے ذکر میں وہ جذباتی وابستگی عود کر آتی ہے اور میں اس کے بارے میں لکھتی چلی جاتی ہوں۔ قرۃ العین حیدر لکھنؤ کا ذکر کرتے ہوئے بہت جذباتی انداز اختیار کرتی ہیں:

"وہ ایک ایسا شہر ہے جہاں ہر صبح امرا کے محلات کی صفائی ہوتی ہے۔ سڑک کنارے دکانوں کی خوب آرائش کی جاتی ہے۔ میدانوں میں لوگ گروپوں کی صورت میں ورزش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ساون آتا ہے تو حیات بخش، ٹیڑھی کوٹھی، کنکر والی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل اور اسی طرح کی دیگر حویلیوں میں ساون رت منانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ دوپہر ہوتی ہے تو طعام خانوں میں رونق بڑھ جاتی ہے بیگمات مہریاں اور خواصیں اپنی اپنی متعلقہ سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ شام ڈھلے پرندے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ غروب آفتاب کے وقت پورا شہر خوشبو میں بس جاتا ہے۔ کنجڑنیں، تنبولنیں، بھٹیارنیں گلیوں اور بازاروں میں ساون کے گیت گاتی پھرتی ہیں"۔ 11

یہ لوگ بہت ہی پر سکون، نفیس اور باوقار زندگی گزار رہے ہیں اور بہت خوش ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی ایک عظیم ترین تہذیب کے نمائندہ لوگ ہیں۔ یہ معاشرہ مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہیں ہے۔ تمام انسان مختلف مذاہب کو ماننے والے ہیں اپنی اپنی زبان میں اپنے اپنے رنگ میں اپنے اپنے خدا کو، اپنے اپنے انداز میں یاد کرتے ہیں۔ رام چندر کے زمانے سے لے کر شجاع الدولہ تک یہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے رنگ میں اللہ کی عبادت میں مصروف رہے ہیں۔

اس معاشرے کو امن کا گہوارہ اور پرستان نما بنانے والا نواب آصف الدولہ جس کا نام بڑے عزت و احترام سے لیا جاتا تھا، بے حد سخی اور تعصب سے پاک حکمران اپنی عوام سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور عوام بھی اپنے اس نواب پر جان چھڑکتے تھے اور اس کا دم بھرتے تھے۔

"ٹھہرو اصف الدولہ...... یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھے، وہی اصف الدولہ، اس کا نام لے کر ہندو دکاندار صبح کو اپنی دکانیں کھولتے ہیں۔ جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ۔"12

لکھنؤ اپنی بھیرویں، بہاگ، پیلو اور سوہنی جیسے راگوں کا منبع و مرکز اور ہندوستان کی عظیم الشان موسیقی کا امین ہے۔ جہاں طوائفوں کے کوٹھے فحاشی کے اڈے نہیں، تہذیب کے مراکز ہیں۔ جہاں رقص و سرود کی محافل برپا ہوتی ہیں اور موسیقی کے جشن منائے جاتے ہیں۔ جہاں ناٹک ہوتے ہیں اور مختلف لوگ داستانوں اور مذہبی قصوں کے سوانگ بھرتے ہیں اس معاشرے میں ایک جا گیردار معاشرے کی تمام تر اچھائیاں اور برائیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں رقاص بھی رہتے ہیں اور بھانڈ بھی، یہاں طبلچی بھی ہیں اور مہان گویے بھی، شاعر بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی، قصہ خوان بھی ہیں اور داستان گو بھی، بانکے بھی ہیں اور نقال بھی۔ اس ثقافتی رنگارنگی کی بدولت یہ شہر ایک رومانوی داستان کا منظر پیش کرتا ہے۔

اپنے ثقافتی رومانس اور تہذیبی رچاؤ کی وجہ سے یہ شہر اور شاندار تعمیرات، اپنی سخاوت، فن کی قدردانی اور عوام کو معاشی خوشحالی دلانے کی وجہ سے آصف الدولہ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

وہ جہاں بھی گئیں، وہاں کی تاریخ، ثقافت، تمدن اور فنون لطیفہ کو بغور دیکھا اور سمجھا اور وہاں کی طرز زندگی کا مشاہدہ بھی کیا۔ وہ بنارس گئیں، دہرہ دون گئیں، علی گڑھ گئیں، جزائر انڈمان گئیں، کلکتہ گئیں،، ڈھاکا گئیں، چٹا گانگ گئیں، حیدر آباد دکن گئیں، پٹنہ گئیں، امرتر گئیں، جالندھر گئیں، الہ آباد گئیں، بھوپال گئیں، بہار گئیں، گجرات گئیں، لاہور گئیں، پشاور گئیں، کراچی گئیں کوئٹہ گئیں، اسلام آباد گئیں......وہ پورے ہندوستان میں گھومیں اور اس کی رنگارنگ ثقافت کو اپنے ثقافتی ورثے کا حصہ بناتی گئیں، اس گل دستے میں ایک کے بعد ایک پھول پروتی گئیں۔ اور یہ سارے سفر "قرۃ العین حیدر" کو امر کرتے گئے اور یہی رنگ ان کی تحریروں میں جھلکتے ہیں:

> "قرۃ العین حیدر کے ادبی اسلوب کی تشکیل میں ان کی فکری تربیت، طرزِ احساس، خاندانی پسِ منظر، تہذیبی ورثہ اور ان کا زندگی کی طرف عمومی مثبت رجحان، رویہ، ردِعمل اور نقطہ نظر کا خاصا دخل ہے چونکہ اُن کے اسلوب کو اُن کی انفرادیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا اسی وجہ سے اُن کے اسلوب میں ٹھہراؤ بھی ہے اور تغیر بھی۔"13

حوالہ جات

1. ۔ روشنائی، سجاد ظہیر، تحریک کا فکری و تہذیبی پس منظر، پہچان آرٹس سٹی ٹاور لاہور،۲۰۰۶ء، ص ۶۰
2. ۔ قرۃ العین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں، ’’حرف چند‘‘ جمیل احمد جالبیڈاکٹر، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۹ء، ص ۲
3. ۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص ۴۴
4. ۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص ۶۳
5. ۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص ۶۳
6. ۔ قرۃ العین حیدر، قرۃ العین حیدر تحریروں کے آئینے میں، اختر سلطانہ ڈاکٹر، حیدرآباد انڈیا: مکتبہ شعر و حکمت،۲۰۰۵ء، ص ۲۰۸
7. ۔ کوہ دماوند، قرۃ العین حیدر، حیدر آباد: ایجوکیشنل پبلی سنگ ہاؤس 2000ء، ص 45
8. ۔ کوہ دماوند، قرۃ العین حیدر، حیدر آباد: ایجوکیشنل پبلی سنگ ہاؤس 2000ء، ص 45
9. ۔ اردو میں خواتین سفرنامے کی کہانی، صالحہ صدیقی، اودھ نامہ،۱۸ فروری ۲۰۲۰ء
10. ۔ کار جہاں دراز ہے، قرۃ العین حیدر، جلد دوم، دہلی: فن اور فن کار،۱۹۷۹ء ص ۱۰۰
11. ۔ قرۃ العین حیدر، "آگ کا دریا" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص ۱۴۳
12. ۔ قرۃ العین حیدر، "آگ کا دریا"، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء، ص ۱۴۵
13. ۔ قرۃ العین حیدر کا زندگی دوست ادبی اسلوب و آہنگ، نیا دور ۱۹ جولائی ۲۰۲۰ء